مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہٗ
ترجمہ شمس تبریز خاں

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ

مولانا مدظلہٗ کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے عربی میں نشر ہوئی اور مکۃ المکرمہ کے مشہور مجلہ "الحج" میں شائع ہوئی تھی۔

(کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

www.abulhasanalinadwi.org

سنہ ۱۹۲۵ء میں جب میری عمر دس سال کی تھی مجھے ندوۃ العلما
ء ایک اجلاس لکھنؤ میں شرکت کا موقع ملا۔ دارالعلوم کا ہال اپنی وسعت
ء باوجود بھر چکا تھا، اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب پر میری
بہ مرکوز ہوکر رہ گئی جن کے حسن وجمال، وقار اور رکھ رکھاؤ، باس
پاکیزگی اور زیبائی کا نمونہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اس شخصیت میں علماء وامراء کی تمکنت اور ادبار کی ظرافت
افت اس طرح جمع نظر آئی کہ گویا وہ ممالکِ اسلامیہ کا کوئی
ل بادشاہ اور سربراہ ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہوگیا
صدرِ جلسہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
رہ کے رئیس اور حیدرآباد دکن کے صدر الصدور امورِ مذہبی
مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان سے زیادہ منصبِ صدارت کی
سے عزت افزائی ہو رہی ہے۔

یہ میری پہلی سرسری زیارت تھی۔ بعد میں تو اس شخصیت
بہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ہر سال دارالعلوم ایک یا دو بار
سے بھی زیادہ مرتبہ آتے رہتے تھے وہ اس کی مجلسِ انتظامی
ارکین اور اس کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی آمد کے
راز کے اعزاز میں دارالعلوم کے طلباء ضرور کوئی نہ کوئی
تہ رکھتے جس سے وہ خطاب کرتے تھے۔

وہ ایک بہترین خطیب تھے جن کو مثال کے طور پر
جاسکتا تھا۔ ان میں خطابت کی بیشتر خصوصیات شرائط
کی تھیں اور ماہرینِ بلاغت نے خطیب وشیوا بیان
لے جو اوصاف بتلائے ہیں وہ ان میں سے بیشتر کے حامل
کشیدہ قامت، دلکش شخصیت، واضح اور صاف لہجہ
۔ ای نسبی، توازن واعتدال، مبالغہ اور غرور سے پاک
ر خود اعتمادی کے مالک تھے، اس لئے اپنی خطابت
ں کا دل جیت لیتے اور قلب ونظر میں سما جاتے۔
ت اور مطالعہ کے لحاظ سے جب کچھ آگے بڑھا تو
ب علمائے سلف" پڑھی جس نے میرے دل و
ر گہرا اثر چھوڑا وہ میری محسن کتابوں میں سے ہے، اس

نے میرے اندر علم کا شوق اور طلب پیدا کی اور میرے اس
احساس میں مدارسِ عربیہ کے طلباء وفضلاء کی بڑی تعداد شریک
ہے جو طلبِ علم کی راہ میں اپنے علوئے ہمت اور جدوجہد، شب
بیداری اور علوم وفنون سے استفادے کے شغف کو اس
کتاب کا احسان سمجھتی ہے۔

پھر ان کی کتاب "سیرۃ الصدیق" پڑھی جو ان کی ان کتابوں
میں ہے جو ان کے قلب ووجدان کے سرچشمے سے سیراب ہوکر
ان کی ترادشِ قلم بنی ہیں اور یہی وہ صفت ہے جو کسی کتاب
کو حسنِ قبول اور تاثیر عطا کرتی ہے۔ وہ جب بھی سیدنا ابوبکر
صدیق رضؓ کا اپنے خطبات ومجالس میں ذکر کرتے تو بے اختیارانہ
طور اور والہانہ انداز سے ان کے زہد وورع، خلافت اور
بیت المال کے سلسلے میں امانت ودیانت کے واقعات اور
اپنی اہلیہ محترمہ کی شیرینی کے لئے بچائی ہوئی رقم کی بیت المال
کو واپسی اور زائد از ضرورت کہہ کر اس رقم کو منسوخ کردینے
کے واقعہ کو مؤثر اور گلوگیر آواز میں بیان کرتے اور بڑی مشکل سے
اپنے اوپر قابو پاتے تھے۔

پھر آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ صفِ اوّل کے ادیبوں
میں اور اردو کے ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں جن کا
اسلوب قلتِ الفاظ واختصار اور کثرتِ معانی وبلاغت کے
لئے ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان
کی تاریخ نگاری میں بھی ایک ادبی شان ہے جس کے سبب
قاری کے سامنے اچانک کوئی بے ساختہ جملہ آجاتا ہے اور اس
پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور کبھی خوبصورت فارسی
ترکیبیں نادر پیرائے میں سامنے آجاتی ہیں۔ اپنا خیال ہے
کہ گزشتہ علماء وامراء میں سے بہت سے تو بڑے ادباء میں شمار
ہوتے اس لئے کہ لوگ عام طور پر پیشہ ور ادیب اور ادب کو
روزی کا ذریعہ بنانے اور بہت سی کتابیں لکھنے والے اہلِ قلم ہی کو
ادیب سمجھتے ہیں اور جو شخص ادب کو علم ودین سے ہم آہنگ
کردے یا صاحبِ ثروت اور زہد وتقویٰ کا حامل ہو تو اسے

صاحبِ طرز ادیب ماننے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ ادبی اور
تاریخی کتابوں پر ان کے مقدمے، ندوۃ العلماء میں دیئے ہوئے
خطبے، اردو کانفرنس لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں
ادبِ عالیہ اور انشائے بلیغ کی بہترین مثال ہیں۔

ان کی ریاست وامارت نے ان کے عالمانہ پہلو کو بھی
کسی حد تک نقصان پہنچایا ورنہ وہ بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے
اس لئے کہ انھوں نے علومِ عقلیہ ودینیہ اور شعر وادب کی
تعلیم ان فنون کے کامل اساتذہ سے دقتِ نظر کے ساتھ حاصل
کی تھی اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے حلقۂ درس
سے تکمیل کی تھی جو اپنے عصر کے استاذ الکل تھے۔ اسی طرح
ان کی ندوۃ العلماء کی تقریریں اور قدیم مدارس کے مروجہ
طریقِ تعلیم پر ان کے اصلاحی مقالات اور خطیب بغدادی
کی تاریخ بغداد کی تنقید ان کے پختہ علم اور عمیق نظر کی گواہ ہیں۔

وہ ایک بڑے مؤرخ تھے اور علمی مراجع ومآخذ کی
وسیع معلومات رکھتے تھے۔ وہ علم وادب کی پیش رفت سے برابر
تعلق قائم رکھتے تھے اور اس کے رواں دواں قافلے سے سن
رسیدگی اور مشاغل کے باوجود پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ان کو
تازہ ترین مطبوعات کی برابر فکر رہتی تھی جن سے اپنے قیمتی
کتب خانہ کو آراستہ کرتے اور مطالعہ کرنے کے بعد ان پر
اپنی رائے بھی ظاہر کرتے اور کبھی کبھی ہندوستان کے بلند
پایہ ماہوار رسالہ "معارف" میں مضامین لکھتے جو علامہ سید
سلیمان ندوی کی ادارت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے نکلتا تھا،
وہ اپنے عہدِ شباب میں ادیبِ کبیر ومؤرخِ شہیر علامہ شبلی نعمانی کے
ساتھ مجلہ "الندوہ" میں بھی رہ چکے تھے جو اپنے وقت کا ایک عظیم علمی
رسالہ تھا اور علمی حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا
اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنے عنفوانِ شباب میں اس کے نائب مدیر
رہ چکے تھے۔

ان کا محبوب موضوع ہندی اسلامی ثقافت، اس کے اشخاص،
رجال، علماء کے اخلاق، ان کی قناعت وپاک نفسی، خودداری، علمی
اشتغال اور درس ومطالعہ میں انہماک کا تذکرہ تھا اور جب اپنے
استاذ مولانا لطف اللہ صاحب کا تذکرہ فرماتے تو اچانک ان کی

نگاہِ تصور میں ان کی مجالسِ درس اور ان کی شخصیت کی تصویر پھر
جاتی اور پھر وہ ہر چیز سے غافل ہوکر اہلِ مجلس سے اس کا تذکرہ
کرنے لگتے۔ ان کی کتاب "استاذ العلماء" جس میں انھوں نے اپنے
محبوب استاذ کا تذکرہ لکھا اور قارئین سے ان کا تعارف کرایا ہے۔
تاریخ وتراجم کی مثالی کتابوں میں سے ہے اور استاذ سے ان کی
وابستگی ووفاداری اور شدتِ تعلق کی خبر دیتی ہے۔ وہ ہندوستان
کے آخری فارسی داں ادیبوں میں تھے اسلئے کہ ہندوستان میں فارسی
ادب اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہوگیا تھا۔ وہ فارسی میں استادانہ اشعار
بھی کہتے تھے اور فارسی کے مشاہیر شعراء کے منتخب اشعار انھیں نوکِ زبان
رہتے تھے۔ ان کی غزلیات وقصائد کے دلکش حصوں کے انتخاب میں
ان کا ذوق بہت بلند اور ان کی نظر بڑی ناقدانہ وبصیرانہ تھی اور
فارسی ادب کے اس ذوق وکمال میں ان کے دوست مولانا ابوالکلام
آزاد کے سوا ان کا کوئی سہیم وشریک نہ تھا جس کی گواہی ان دونوں
حضرات کے مراسلات اور مخاطبات سے ملتی ہے جو "کاروانِ خیال"
اور "غبارِ خاطر" میں شائع ہوچکے ہیں۔

انھیں کتابوں کے جمع کرنے اور علمی نوادر وقدیم تالیفات کو فراہم
کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انھیں اپنا یہ قیمتی کتب خانہ بہت عزیز تھا
جو قلمی کتابوں اور قدیم نوادر کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے کتب خانوں
میں شمار ہوتا ہے۔ اہلِ علم دور دور سے اس کی زیارت اور اس سے استفادہ
کے لئے آتے اور اپنی کتابوں کے مقدموں اور مقالات میں اس کا اعتراف
کرتے تھے۔ انھیں اس کتب خانہ کا خاص خیال رہتا تھا اور وہ برابر اس
کے سرمایہ میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے ایک ضخیم اور
مفصل فہرست بھی تیار کی تھی جس میں کتابوں کی خصوصیات، مؤلفین اور
دوسری ضروری باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس فہرست سے ان کی وسعتِ
معلومات اور مطالعہ کے انہماک کا پتہ چلتا ہے۔

انھوں نے صرف انھیں علمی فضائل پر قناعت اور اکتفا نہیں کیا
بلکہ علم وفن کے پہلو بہ پہلو ایمان واحسان کے ذریعہ اپنی باطنی دنیا بھی آباد
کی، اپنے اوقاتِ عزیز کو اللہ کے ذکر سے معمور کیا اور اس طرح دین ودنیا
کی حسنات کو جمع کرنے کی بھی کوشش کی اور اس مقصد کی خاطر ایامِ
جوانی ہی میں شیخ المشائخ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ
سے تعلق پیدا کیا اور ان کی صحبت ومعرفت سے فیض پایا اور عمر بھر اس

www.abulhasanalinadwi.org

"وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں"

ابتدائے عمر سے جن چند شخصیتوں کی عظمت قلب و دماغ پر نقش ہوئی اور وہ ایک مثالی اور قابلِ تقلید (آئیڈیل) انسان کی حیثیت سے تصور و نگاہ کے سامنے ہمیشہ کھڑی نظر آئیں ان میں ایک نمایاں شخصیت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی تھی، افتادِ طبع کہیے یا خاندانی ماحول یا تعلیم و تربیت کا کرشمہ، کہ انسانی کمالات میں سے جس چیز نے ہر دور میں سب سے زیادہ گرویدہ کیا، وہ جامعیت، اعتدال و توازن اور وسیع و متنوع ثقافت (کلچر) تھی، اور نواب صاحب مرحوم اس آخری دور میں (میرے محدود علم و تجربہ میں) اس کا مظہر کامل تھے، ان کے اس امتیاز کو محسوس کرنے اور سمجھنے کے لئے جیسے مواقع اس راقم کو میسر آئے بلا کسی شائبہ فخر و تعلّی کے اس کے کہنے میں باک نہیں کہ وہ ہر ایک انسان کو آسانی سے میسر نہیں آتے۔ گھر میں اعیان و مشاہیر و اہلِ کمال کے تذکرے اور حالات کا (نزہۃ الخواطر کی شکل میں) ایک وسیع ذخیرہ تھا، جس نے کم سے کم اس ملک کے عہدِ ماضی کی باکمال شخصیتوں سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا۔ پھر ہندوستان سے باہر جانے اور ایسی مجلسوں میں باربار شرکت کرنے کا اتفاق ہوا اور ان میں سے بعض اداروں اور جماعتوں کی مستقل رکنیت کا شرف حاصل ہوا جن میں عالمِ اسلام اور ممالکِ عربیہ کے چیدہ و برگزیدہ اشخاص اور ممتاز اہلِ علم جمع ہوتے تھے اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر بہت سے ایسے ملکوں میں قیام کا موقع ملا جو اسلامی علوم اور تہذیب و ثقافت کا عرصۂ دراز سے مرکز چلے آرہے ہیں اور ان کی مردم خیزی مسلّم ہے اس کے بعد امیر خسرو کے پُر اعتماد لہجہ ہی میں جس میں انھوں نے آفاق و انفس کی وسیع واقفیت کے بعد اپنے محبوب ممدوح کی انفرادیت کی شہادت دی ہے[1]۔ یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ نواب صاحب کی سی جامعیت اور وسیع و متنوع ثقافت کا آدمی نظر نہیں پڑا۔

یہ جامعیت اُن کی شخصیت کے لئے ایک بڑا حجاب بن گئی اور عہدِ ماضی میں بھی یہ سانحہ (جو کسی نقص نہیں کمال کا نتیجہ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کمال کا تاوان ہے) متعدد باکمال شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے اور اس نے ان کے بہت سے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے ساتھ اچھے اچھے صاحبِ نظر مورخ پورا انصاف نہیں کرسکے ہیں، معاصرین کی نگاہ اور مورخین کا قلم ہمیشہ سے اپنے ممدوح کو کسی ایک خانہ میں فٹ کرنے اور اہلِ کمال کی کسی ایک صف میں جگہ دینے کا عادی رہا ہے لیکن جب ایک شخصیت مختلف خانوں میں جگہ پانے اور اہلِ کمال کی ہر صف کی زینت بننے کی اہلیت رکھتی ہے تو بعض اوقات وہ حیرت کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس کی صحیح جگہ اور مقام متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نواب صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، ان کی امارت و ریاست ان کی عالمانہ حیثیت کے لئے حجاب بن گئی اگر وہ خاندانی رئیس نہ ہوتے اور طبقۂ امراء میں ان کا شمار نہ ہوتا تو ہندوستان کے نہایت ممتاز علماء و ادباء کی صفِ اوّل میں جگہ پاتے اسی طرح ان کی دینداری اور طبقۂ علماء میں ان کی شمولیت ادب و شاعری کی بزم میں صدر نشینی سے ہمیشہ مانع رہی اور ادیبوں اور نقادوں اور مؤرخ اردو کے ...

[1] امیر خسرو کا شعر ہے ؎
آفاقہا گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

نسبت کی حفاظت کی۔ آپ نماز جماعت اور نوافل تک کی پابندی کرتے تھے اور سفر و حضر میں معمولات و وظائف میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ آخر عمر میں جب قویٰ کمزور پڑ گئے تھے اور حافظہ دھوکہ دینے لگا تھا اور لوگوں کو پہچاننا بھی مشکل ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود درود کے شغل و معمول میں فرق نہ آیا۔

میں نے اپنے لمبے سفروں اور لوگوں سے تعلقات میں ہر طرح کے اہلِ کمال دیکھے ہیں، میں نے اہلِ قلم کو بھی دیکھا ہے، اہلِ دین کو بھی دیکھا، ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملا، لیکن میں نے ان جیسا متضاد صفات کا جامع اور متنوع شخصیت کا حامل نہیں دیکھا۔ وہ حلقۂ امراء میں امیر، دبستانِ ادبا میں ادیب، طبقۂ شعراء میں شاعر، مصنفین کی دنیا میں مصنف، ناقدین کی صف میں ناقد و مبصّر اور ماہرینِ تعلیم کی محفل میں ایک ماہرِ تعلیم تھے اور جب کسی مجلس میں یہ سب جمع ہوتے تو وہ صدرِ محفل اور شمعِ انجمن ہوتے اور لوگ پروانہ وار انھیں گھیر لیتے، اُن سے رہنمائی طلب کرتے اور میرِ مجلس بناتے۔ اسی وجہ سے آپ انھیں حیدرآباد میں وزیرِ امورِ مذہبی بھی بنتے دیکھتے ہیں۔ اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مستقل سکریٹری بھی۔ وہ ایک طرف دارالمصنفین کے دائمی صدر بھی نظر آتے ہیں اور باربار ندوۃ العلماء کے اجلاس کے صدر بھی۔ بارہا اردو کانفرنسوں کی صدارت کے لئے منتخب ہوتے ہیں مسلم یونیورسٹی انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دیتی ہے اور شعبۂ دینیات کا اعزازی صدر رہا ہے۔ کبھی آپ انھیں دیوبند کے قدیم دارالعلوم میں خطاب کرتے ہوئے پاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کسی جدید یونیورسٹی جیسے جامعہ عثمانیہ یا مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے سنتے ہیں، کبھی کسی ادبی محفل کی صدارت کرتے پاتے ہیں اور کبھی کسی اورینٹل کانفرنس ... اسی طرح ہم انھیں مختلف زبانوں اور ثقافتوں کا حامل ... دیکھتے ہیں، وہ ایک طرف آگرہ کے کالج میں انگریزی کی تحصیل کرتے ہیں اور دوسری طرف مولانا لطف اللہ صاحب کے مدرسے سے تکمیل بھی۔

انھیں اپنے بچپن ہی سے جاننے میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ وہ میرے والد ماجد مولانا سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے دوست اور ندوہ کی تاسیس میں ان کے شریک و رفیق تھے پھر اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب سے تعلق میں بھی دونوں حضرات ساتھ تھے۔ مجھے جب دیکھتے تو اپنے سینے سے لگاتے اور اولاد کا سا برتاؤ کرتے، میری ان کی مراسلت بھی رہی جسے میں نے محفوظ رکھا ہے۔

جب ہم نے رفیقِ محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کے ساتھ مل کر ماہنامہ 'الندوہ' نکالنا شروع کیا تو ہندوستانی اہلِ علم و فکر سے ان کی محسن کتابوں کے بارے میں سوالنامہ جاری کیا جس میں اُن سے ان کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تھا جن کا ان کی ذہن سازی و ثقافت اور تعمیرِ سیرت پر خاص اثر رہا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مولانا شروانی سے درخواست کی کہ وہ اپنے مقالے سے اس سلسلے کا افتتاح کریں۔ آپ نے میری فرمائش کو شرفِ قبول بخشا اور ایک قیمتی مقالہ عنایت فرمایا جو ان کے وسیع و متنوع مطالعہ، کتابی دنیا کی طویل سیاحت، سلامتِ فکر، صفائے ذہن کا آئینہ دار تھا۔ یہ مقالات کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے تھے۔

مولانا شروانی گذشتہ ثقافت و تہذیب کے کارواں کے آخری مسافر تھے اور اللہ نے انھیں اپنے ساتھیوں سے اس لئے روکے رکھا تھا تاکہ عہدِ حاضر کے لوگ بھی ان سے فائدہ اُٹھائیں اور ان کے پیکرِ مثالی سے قدیم عہد کے باکمالوں جیسے صاحب بن عبادؓ، امیر ابوالفضل میکالی، سلطان عالی عبدالعزیز، آصف خاں وزیر گجرات اور خواجہ عماد الدین محمود گاواں گیلانی کی شخصیتوں کا اندازہ کرلیں اور ان کے بارے میں کہی گئی باتوں کی تصدیق کرلیں۔ پھر جب ان کے اور ان کے زمانے کے درمیان دوری بڑھنے لگی اور ان کمالات کا سمجھنا مشکل ہوگیا، جن کے وہ حامل تھے، اور انھیں بھی یہ غریب الوطنی کھلنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یوم جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو اذنِ سفر دے دیا اور وہ اپنے دوستوں اور رفیقوں سے جاملے اور علمی اور دینی زندگی میں ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پُر ہونا قریبی مدت میں نظر نہیں آتا۔

www.abulhasanalinadwi.org

... کہ وہ زمرۂ لاابالی، بیشتر ادیب اور ایک فنی صاحبِ کمال و صاحبِ قلم نہیں اور ان کی دوکانِ کمال پر ایک ہی مال اور ایک ہی جنس نہیں پائی جاتی بلکہ ہر جوہر کمال کے طالب کو اپنی مراد ملتی ہے، بے ادبی کی ہزار بار معافی چاہتے ہوئے ادب کے ادنیٰ طالب علم اور شیدائی کی حیثیت سے یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ کسی ایک ملک کے ادب و زبان کا سوال نہیں دنیا کی بہت سی زبانوں اور ادب کے علمبرداروں کی شروع سے یہ کمزوری رہی ہے کہ جو ادیبوں کی وردی پہن کر اور دین و اخلاقیات سے رشتہ و ناتہ توڑ کر ان کی بزم میں نہیں آیا اس کو انھوں نے یا تو محفل میں آنے کی اجازت نہیں دی یا بادلِ ناخواستہ جگہ دی۔ ادب جس کو تقلید و روایت پرستی سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہیئے تھا اور جس کے خمیر و سرشت میں جدّت و جرأت ذہانت ذوقِ جمال اور ادب کی زبان میں حسن پرستی داخل ہے اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور ہر مظہرِ جمال و کمال کا شیفتہ و فریفتہ ہونا چاہیئے۔ اکثر موقعوں پر روایت پرست تعصب کا شکار اور رسم و رواج میں گرفتار نظر آتا ہے۔ ادب و انشار کی جو تعریف اُستادِ اوّل. . . . . . . نے کر دی اور اس کے حدود و خطوط کھینچ دیئے بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو اس سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوئی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا پیشروؤں کے قدم بہ قدم رکھتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے اور ادبی نمونہ کے ذخیرہ میں کسی اضافہ کسی تغیر اور کسی ترمیم کی جرأت نہیں کرتا ادب و انشار کی چند مثالیں منتخب کر لی جاتی ہیں اور ہر آنے والا اسی سبق کو دہراتا ہے اور اقبال کا یہ مصرع اس دبستانِ ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

[illegible] رابطے

اگر نواب صاحب کا یہ گناہ نہ ہوتا کہ وہ ایک عالمِ دین، صورتاً و سیرتاً متشرع، ثقہ و سنجیدہ بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ یہ کہ انھوں نے اپنی دوکانِ کمال پر ادب اردو کا سائن بورڈ نہیں لگایا تو وہ ہندوستان کے صاحبِ طرز انشا پردازوں کی صف میں جگہ پاتے اور ان کے خطوط و مضامین کے بہت سے ٹکڑے اردو ادب کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کئے جاتے اور شاید بعض اہلِ نظر یہ کہنے کی جرأت کرتے کہ غالب کی "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کے بعد ان کی برجستگی و بے ساختگی کسی نے اپنے خطوط میں اس سے زیادہ نہیں دکھائی لیکن اب وہ اس ناانصافی پر مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کی زبان میں جن کے وہ بہت بڑے معتقد و مقلد تھے، ان الفاظ میں شکوہ سنج پائے جاتے ہیں کہ:۔

بر لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

یہی معاملہ ان کی فارسی ادب و زبان کی اداشناسی اور نقدِ سخن کا ہے کہ میرے محدود علم میں علامہ شبلی اور خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے بعد ان کا جیسا فارسی داں، صاحبِ ذوق و نقاد نہیں گزرا، لیکن اس وصف پر ان کے دوسرے کمالات نے پردہ ڈالا اور بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہونے پایا۔

پھر اس سب سے بڑھ کر وہ ایک درد آشنا، صاحبِ دل، روشن ضمیر اور صاحبِ باطن شخص تھے، جس کا ثبوت ان کی زندگی کی بے نظیر استقامت اور ان کے سفر نامۂ حجاز کی سطر سطر سے ملتا ہے، اور جس کی شہادت ان کے زمانہ کے بعض ممتاز ترین اہلِ نظر اور اصحابِ باطن نے دی؎ لیکن ان کی یہی جامعیت، امارت و صدر الصدوری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں شرکت، اردو ادب و زبان کے جلسوں کی صدارت، ان کی انگریزی دانی اور

؎ ... نے خود نامہ نگار کے مشہود عارف و بزرگ مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی سے سنا کہ "مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی اہل اللہ میں سے ہیں"

جدید تعلیم یافتہ، آزاد خیال طبقہ میں مقبولیت و احترام ان کے اس وصف کے لئے ایسا حجاب بن گیا کہ بہت سے لوگ ان کو طبقۂ امراء ہی کا فرد سمجھتے رہے اور عجب نہیں کہ بعض متشددین نے ان پر نیچریت کا فتویٰ لگا دیا ہو، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا عمل شیخ سعدیؒ کی تعلیم ؎

درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار

پر تھا۔ مولانا جامیؒ نے اپنے زمانہ کے ایک ایسے ہی درویش سیرت، امیر صورت، وزیرِ مملکت خواجہ عماد الدین محمود گاواں وزیرِ اعظم سلطنتِ بہمنیہ کے متعلق جو کہا تھا، نواب صاحب پر پورے طور پر صادق آتا ہے ؎

ہمہ جہاں را خواجہ دہم فقر را دیباچہ اوست
آیت الفقر و لکن تحت استار الغنا

پھر ان کی زندگی کا خاص جوہر ان کی وہ وسیع و بوقلموں گوناگوں ثقافت تھی جس میں وہ فرد فرید تھے، ہندوستان میں اسلامی عقائد و تعلیمات کے فیض، تصوف کے پیدا کئے ہوئے درد و محبت اور وسعتِ نظر، ہندوستان کے خمیر کی آشنا پرستی اور وفاشعاری، رنگ و آہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی و سپہ گری، افغانوں کی شجاعت و شرافت، مغلوں کے ذوقِ جمال و قوتِ انتظامی، عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوز و دروں سب سے مل کر ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ثقافت وجود میں آئی جس کا نمونہ طبقۂ امراء میں عبد الرحیم خانِ خاناں، شعراء میں امیر خسرو، اہلِ دل میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور علماء میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نظر آتے ہیں، اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے اور تواضع بھی، حلاوت بھی ہے اور مروّت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور وضعداری بھی، اس کی قلمرو میں علومِ شریعت و حکمت بھی ہیں اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے اور نفاست و ذوقِ لطیف بھی، اس کی وسعت کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے حلقے بھی ہیں اور مشاعرے بھی، اس میں ثقاہت بھی ہے اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روحی بھی، اس کے اظہارِ خیال اور اظہارِ کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی، اردو بھی ہے اور ہندی بھی، یہ وہ تہذیب و ثقافت ہے جس نے فاتحینِ اسلام کے داخلۂ ہند کے بعد سے اپنا کام کرنا شروع کیا، پھر شاہجہاں و عالمگیر کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت ہے جو نہ خالص ہندوستانی ہے نہ خالص ایرانی، نہ عربی ہے نہ عجمی، بلکہ ان سب کے محاسن کا مجموعہ اور تہذیب و تمدن کے میدان میں ایک نیا تجربہ۔ یہی تہذیب و ثقافت تھی جس کے آخری نمونوں میں سے ایک نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، اور جو غالباً اپنی پختگی، توازن اور جامعیت کے لحاظ سے ان ہی پر ختم ہو گئی۔

نواب صدر یار جنگ

مشاہدات و مراسلات کے آئینہ میں

رسالہ کے ابتدا میں قارئین کی نظر سے جو ریڈیائی تقریر گذری ہے اس سے ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ میری آنکھیں ان کے جمال و کمال کے مشاہدہ سے سب سے پہلے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۵ء میں روشن ہوئیں۔ یہ پہلی زیارت تھی،

نواب صاحب سال میں کم سے کم دو مرتبہ ندوۃ العلماء کی مجلسِ انتظامی کے جلسہ میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لاتے تھے، اخلاق روایات اور قدیم تہذیب و وضعداری کا نمونہ تھے، اس زمانہ کے بزرگ اور شرفاء جہاں ایک دو بار ٹھہر جاتے اور جس دوست یا عزیز کو

www.abulhasanalinadwi.org

...بیدہ بزرگ یا اہم مصلحت کے ماسوا بالعموم انھی کے یہاں قیام کرتے۔ نواب صاحب کا معمول لکھنؤ میں منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری (فرزند منشی امتیاز علی صاحب وزیر بھوپال) کی کوٹھی واقع خیالی گنج میں قیام کا تھا، میرے علم میں اس معمول میں شاید کبھی فرق آیا ہو، منشی صاحب ان کے پیر بھائی بھی تھے۔ ندوۃ العلماء کی خدمت، رکنیت اور حمایت و تائید میں قدیم سے رفیق و شریک اور قدیم تہذیب و وضعداری کا نمونہ اور اودھ کے شرفاء و رؤسا کی بہترین خصوصیات کے نمائندہ تھے۔ اس طبعی مناسبت، ہم خیالی و ہم مذاقی اور نسبت کے اتحاد نے اس انتخاب کو اور زیادہ موزوں اور اس قیام کو اور زیادہ خوشگوار بنا دیا تھا۔ نواب صاحب نے منشی صاحب کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے اور جو مقالات شروانی کے مجموعہ میں شامل ہے، اس سے مذاق و مزاج کے اس اتحاد کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے جو ان دونوں دوستوں اور بزرگوں میں پایا جاتا تھا۔

لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں یہ معمول ہو گیا تھا کہ میرے برادرِ معظم (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ) جو ندوہ کے مجلس انتظامی کے رکن اور بعد میں ناظم بھی منتخب ہوئے ایک بار ضرور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے، میں سلام کرتا، نواب صاحب بڑی شفقت سے سر پر ہاتھ رکھتے، دعا دیتے، تعلیم کا حال پوچھتے اور میں کچھ دیر ٹھہر کر سلام کر کے رخصت ہوتا۔ اکثر تشریف آوری کے موقع پر کم سے کم ایک بار دارالعلوم تشریف لے جاتے، درجوں کا معائنہ کرتے اور اکثر طلبہ کو خطاب بھی۔ تقریر کا موضوع اکثر علوم کی تحصیل میں بلند ہمتی، سخت جفاکشی اور علمائے سلف کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب و تشویق ہوتا، جو ان کا عزیز و لذیذ موضوع تھا، جس پر ان کی مستقل تصنیف شائع ہو کر طلبائے مدارس، شائقینِ علم کے لئے مشعلِ راہ بنی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع نہیں ہوا تھا۔

۱۹۴۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں جو شرقی مسجد سے مسجد خالی تھا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی سعی جمیل سے ایک حسین و جمیل مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی، شعبان کا مہینہ تھا اور دارالعلوم میں تعطیل ہونے والی تھی، مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک جشنِ مسرت منایا گیا۔ نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری اس وقت یو۔پی کے گورنر تھے، جمعہ کا دن تھا، مسجد کا افتتاح ان کے ہاتھوں قرار پایا، وہ صوبہ کے سب سے بڑے حاکم بھی تھے اور خوش قسمتی سے مسلمان پابند نماز اور حافظِ قرآن بھی تھے، اس لئے یہ انتخاب کسی طرح ناموزوں نہ تھا، لیکن مسجد کا جو اصل مقصد و موضوع ہے، اس کا لحاظ کر کے اس کا عملی افتتاح نواب صدر یار جنگ نے فرمایا، انھوں نے جمعہ کی نماز کی امامت فرمائی اور نماز کے بعد موثر اور دلپذیر وعظ کہا، اس مبارک تقریب کے سلسلہ میں ان کا کئی روز لکھنؤ قیام رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں اتفاقاً مولانا مسعود علی صاحب کے اس خس پوش بنگلہ یا "کٹیا" کے سامنے سے گزرا جو انھوں نے مسجد کی تعمیر کی نگرانی اور اپنے قیام کے لئے مسجد کے صدر دروازے کے بالمقابل راستے سے چند قدم پیچھے ہٹ کر ڈال رکھی تھی اور جو اپنی خوشنمائی، صفائی اور مذاقِ سلیم میں امراء کے اچھے اچھے کاشانوں سے آنکھیں ملاتی تھی، میں نے دیکھا کہ نواب صدر یار جنگ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالباری ندوی اور غالباً مولانا عبدالماجد دریابادی بیٹھے ہوئے ہیں، شاید کسی جھونپڑے میں اقلیم علم و ادب کی اتنی باوقار اور سرآمدِ روزگار شخصیتیں ایک وقت میں اس آسانی سے جمع ہوئی ہوں۔ اس وقت یہ "کاشانہ" کہکشاں بنا ہوا تھا جس میں آسمانِ علم و ادب کے کئی روشن ستارے جلوہ افروز تھے۔ نواب صاحب نے مجھے گذرتے ہوئے دیکھا تو آواز دے کر بلا لیا اور بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر فرمایا کہ میں نے جب "گلِ رعنا" میں نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کا تذکرہ پڑھا جو خواجہ میر درد کے تذکرہ کے ایک حاشیہ میں ہے تو مولانا مرحوم (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف "گلِ رعنا") کے ان کے متعلق یہ الفاظ پڑھ کر بڑا رشک آیا کہ مجھے ان کی خدمت میں پندرہ سال سے نیاز حاصل ہے لیکن جب میں نے اپنا حال پڑھا اور اس میں یہ دیکھا کہ میرے ان سے تعلق کی مدت تیس برس ہے تو رشک جاتا رہا۔ میری آنکھوں میں وہ نقشہ ابھی تک گھوم رہا ہے۔ اب اس پایہ کے فضلاء اہلِ کمال ایک جگہ پر کہاں نظر آئیں گے۔

علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جُبلی کے موقع پر جو ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی، میں بھی دارالعلوم کے چند اساتذہ کے ساتھ شرکت کے لئے گیا تھا، نو عمری کا تقاضا کہئے یا شرم و حجاب کا نتیجہ کہ میں پہلے ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا اور نہ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس وقت مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری صاحب مسلم یونیورسٹی کے ناظمِ دینیات تھے، ان سے ہمارے خاندان کے تین پشتوں کے تعلقات تھے۔ ان کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے صاحبزادے اور مولانا ابوبکر صاحب کے والد مولانا ابوالحسن علی صاحب میرے نانا حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب مریدوں میں تھے۔ خود مولانا ابوبکر صاحب کا بھی میرے نانا صاحب سے بیعت کا تعلق تھا، انھیں قدیم تعلقات کی بنا پر میں نے ان کے یہاں قیام کیا۔ نواب صاحب کی مشغولیت کو دیکھتے ہوئے اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ان سے ملاقات کروں۔ اتفاق سے ایک دن کسی ہال سے لکچر سن کر نکل رہا تھا کہ نواب صاحب سے سامنا ہو گیا۔ میں نے سلام عرض کیا تو غالباً میری تنبیہ کے لئے تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں فرمایا کہ کون؟ میں نے نام عرض کیا۔ فرمایا کہاں ٹھہرے ہو؟ عرض کیا کہ مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں۔ فرمایا کون مولانا ابوبکر؟ میں نے حیرت کے ساتھ جواب دیا کہ مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب ناظمِ دینیات۔ فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہاں ایک شروانی بھی رہتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ فرمایا کہ اس کے یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟ میں نے عرض کیا کہ غلطی ہوئی۔ فرمایا کہ مانتے ہو کہ غلطی ہوئی۔ میں نے کہا کہ جی ہاں! فرمایا کب آؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ کل صبح ہی۔ اس دلچسپ مکالمہ پر یہ گفتگو ختم ہوئی، جس سے زیادہ مجھے اپنی غلطی محسوس کرانے کا اور کوئی شائستہ طریقہ نہ تھا۔ میں اگلے ہی روز اپنا سامان لے کر حبیب منزل پہنچ گیا اور اس کوتاہی کی تلافی کی۔

غالباً ۱۹۳۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں تھا۔ مولوی فضل الحق صاحب جو اس وقت بنگال کے چیف منسٹر تھے اور شیرِ بنگال کے نام سے مشہور تھے جلسہ کے صدر منتخب تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور بڑے بڑے عمائد و مشاہیر موجود تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی تمام مجالس اور اجتماعات پر خواہ وہ علمی اور ادبی ہوں، سیاسی ذوق کی فضا چھائی ہوئی تھی اور مسلمانوں کو حقیقتاً سیاست کے علاوہ کسی سنجیدہ موضوع اور تعمیری کام سے حقیقی دلچسپی نہ تھی۔ اس کانفرنس میں جو مناظر دیکھے ان کے تفصیل سے ذکر کرنے کا یہ محل نہیں لیکن نواب صاحب کی موجودگی اور ان کا وقار اس ذوق کو اپنے حدود سے آگے بڑھنے اور ابتذال اور اشتعال کی سرحد میں داخل ہونے سے مانع تھا۔

اسی کانفرنس کے ایام میں میرے مخلص اور بزرگ دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے جو خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ بانکی پور کے ان دنوں کیٹلاگر (مرتب فہرست) تھے، ایک دن مجھ سے کہا کہ آج نواب صدر یار جنگ کتب خانہ دیکھنے آئیں گے، کتب خانہ کی سیر کا اس سے بہتر موقع نہیں، ان کے سامنے کتب خانہ کا کلیجہ نکال کر رکھ دیا جائے گا اور وہ نوادر و مخطوطات پیش کئے جائیں گے جو مشکل سے کسی زائر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھا اور ان کی معیت میں وہاں کا رخ کیا۔ ظہر عصر کے درمیان کا وقت تھا، کتب خانہ کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ نواب صاحب کرسی پر تشریف رکھتے ہیں۔ ایک کرسی پر مولانا سید سلیمان ندوی، دوسری کرسی پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رونق افروز ہیں۔ داہنے بائیں کی دو کرسیاں خالی تھیں نواب صاحب نے داہنی طرف کی کرسی کی طرف اشارہ کر کے

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت سید علی میاں آؤ۔ وہ ہمیشہ مجھے اسی طرح خطاب کرتے تھے۔ بائیں طرف اشارہ کر کے مولانا مسعود عالم صاحب سے فرمایا مسعود عالم یہاں بیٹھو۔ ولی الدین صاحب بانیٔ کتب خانہ کے فرزند کتابیں انتخاب کر کے لا رہے تھے۔ نواب صاحب ان پر کچھ ارشاد بھی فرماتے تھے اور تبصرہ بھی اور گرانقدر معلومات کا اضافہ بھی اور کچھ زیادہ تو یاد نہیں "دیوانِ حافظ" کا ایک نسخہ لایا گیا جو جہانگیر کے مطالعہ میں رہا تھا اور وہ اس میں فال دیکھتا تھا۔ ایک جگہ حاشیہ پر لکھا تھا کہ جہاں پناہ (اکبر) نے طلب فرمایا۔ میں نے فال دیکھی تو یہ شعر نکلا" یہ تاریخی موقع بھی اب پھر کہاں نصیب ہوگا کہ ایک منتخب روزگار کتب خانہ، ایک منتخب روزگار فضلاء اور اہلِ نظر کی موجودگی میں دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، جواہرات پیش ہوتے تھے اور جوہری پرکھ پرکھ کر بتا رہا تھا کہ یہ کس معدن اور کس خزانۂ شاہی کے ہیں اور ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے۔ ؏

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

تھوڑی دیر میں نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ باہر چمن میں جانمازیں بچھا دی گئیں۔ آج تک اس واقعہ پر حیرت ہے اور اس کو بزرگوں کی ایک ادا پر محمول نہ کیا جائے تو اور کیا کہ ان دونوں اساطینِ علم و فضل کی موجودگی میں مجھ بے ہنر کی طرف جو عمر و علم ہر چیز میں چھوٹا تھا، دیکھ کر فرمایا: سید علی نماز پڑھاؤ۔ تعمیل کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ الامر فوق الادب۔

تقسیم کے بعد جب نواب صاحب کو پے در پے ایسے حادثے پیش آئے تھے کہ طبیعت کی شگفتگی اور صحت کی رعنائی رخصت ہو گئی تھی۔ ایک بار علی گڑھ جانا ہوا۔ غالباً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا اور یونین میں میرا پروگرام۔ اس کام سے فارغ ہو کر غالباً خود انھیں کے ساتھ حبیب منزل منتقل ہو گیا۔ خواہرزادہ عزیز مولوی محمد رابع سلمہٗ میرے ساتھ تھے۔ میں نے دیکھا کہ دل و دماغ دونوں پر حوادثِ روزگار اور انقلابِ زمانہ کا گہرا اثر ہے، لیکن وہ موضوع ہے جن میں کوئی تغیر محسوس نہیں ہوتا تھا، وہی تازگی اور وہی تفصیلات اور جزئیات، ایک پیر و مرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن اور محبوب استاد مولانا لطف اللہ صاحب کا تذکرہ، دوسرے کتب خانہ کا ذکر۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مخدومی نواب مولوی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی لاہور گئے ہوئے تھے جہاں صاحبزادۂ گرامی ڈاکٹر مولوی ریاض الرحمٰن خاں پہلے سے مقیم تھے اور ان کی آمد کا انتظار تھا، بار بار فرماتے تھے کہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں آجائیں تو تم حبیب گنج بھیجوں اور تم وہاں کتب خانہ دیکھو، لیکن افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی۔ اس کے بعد ایک بار اور ان کی زندگی میں علی گڑھ حاضری ہوئی۔ مجھے اور مولوی اکرام اللہ خاں صاحب کو کھانے پر مدعو فرمایا۔ اس صحبت میں بار بار ندوہ کے سالانہ جلسہ کا تذکرہ فرماتے رہے اور اپنی اس تمنا کا اظہار کہ ایک بار ان کی زندگی میں پھر ندوہ کا جلسہ آب و تاب کے ساتھ ہوتا اور وہ اس میں شرکت فرماتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اب جبکہ ندوہ کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس کا وقت قریب آ رہا ہے نواب صاحب بے اختیار یاد آتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے دوستوں کے اس لگائے ہوئے باغ کی بہار دیکھ کر کیسے شاداں ہوتے، لیکن ؏

یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم

مجھے ان کے مکتوب الیہ بننے کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب رسالہ "الندوہ" جس کی لوح پر کبھی ان کے اور ان کے محبوب و محترم بزرگ دوست علامہ شبلی نعمانی کے نامِ گرامی نام ہوتے تھے، کا مولانا سید سلیمان ندوی کے حکم سے سہ بارہ اجراء ہوا اور اس کی ادارت و ترتیب کا کام میرے اور صدیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے سپرد ہوا۔ نواب صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ نیازمند کو کئی بار شرفِ مخاطبت بخشا، ان کے اس سلسلہ کے مکاتیب کو حرزِ جان بنا کر رکھا ہے۔ اس مقالہ کو جو ایک طویل سفر کی تیاری کی مصروفیت میں نہایت عجلت اور ذہنی انتشار کی حالت میں لکھوایا جا رہا ہے، انھیں پر ختم کرتا ہوں۔

۱۷۔ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عزیزی مولوی سید سلیمان صاحب نے "الندوہ" میں "ندوۃ العلماء کی تاریخ کے پہلے صفحہ" پر مضمون لکھ کر اگلی صحبتوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ وہ یاد جو اپنے اندر ایک عالمِ حسرت رکھتی ہے ؎

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

(خواجہ حالی مرحوم)

اسی مضمون میں جتانا ہے کہ اس سلسلہ کا رابطہ ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا جس کا نامِ نامی حضرت مولانا فضلِ رحمٰن صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا..... مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا"

مغربی مطلع کا ذکر مولوی صاحب کے مضمون میں بہت کچھ آچکا۔ مشرقی مطلع کا ذکر میں اپنی ایک پرانی تحریر کے ذریعہ سے سناتا ہوں جو آج سے چوّن برس پہلے لکھی گئی تھی۔ میں اس زمانہ میں آگرہ کالج میں پڑھ رہا تھا وہیں سے گنج مرادآباد حاضر ہوا تھا۔ بائیس رجب المرجب کو حاضرِ خدمتِ بابرکت ہوا۔ ۲۵ رجب کو آگرہ واپس جا کر یہ یادداشت لکھی تھی۔

ایک اور بات کہنی تھی جب میں نے اپنے یہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست ختم کی تو اس کی خوشی میں ایک دیوانِ غالب ... حاضرین یا ابیات پر نقل کر کے معارف میں شائع ہونے کے واسطے بھیجا تھا جو شائع ہوا اور موثر ٹھہرا۔

اب "الندوہ" کے دوبارہ اجراء کی خوشی میں یہ ایک قدیم تحریر آپ کو بھیج رہا ہوں پسند ہو تو الندوہ میں شائع کیجیے۔ رسید آئے تو اطمینان ہو جائے گا۔

حبیب الرحمٰن

۲۱ ستمبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم

کام کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ختم ہونے پر پہنچے گا۔ اکتوبر سے سلسلہ شروع کر دیتا۔ زود قلم نہیں ہوں۔ غور کرنا پڑتا ہے۔

حبیب الرحمٰن

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم

مقدس مقام میں صیام مبارک

خط آیا۔ مقالہ پہنچ کر پسند ہوا۔ اس سے اطمینان ہے۔ مقالہ میں ان الفاظ کے بعد "میرے دادا صاحب محمد خان مرحوم صاحب نے" یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں (جن کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھی")

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۵ رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم

الندوہ کا خیال دل و دماغ دونوں میں ہے۔ موقع کا انتظار ہے۔ اس زمانے میں دارالمصنفین کی خدمت جاری ہے خطوط جو آئے ہیں ... کو آپ سے اجازت کی ضرورت ہے۔ یہی میں نے مولوی سید سلیمان سے کہا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہوں۔ آپ سب کی خیریت کا آرزومند ہوں۔

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۲۰ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ

۲۴۔ نومبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم

الندوہ نومبر کا ابھی پڑھ کر رکھا ہے۔ اس کی صحت و

www.abulhasanalinadwi.org

صفائی کا معیار گر رہا ہے۔ اس جانب توجہ کیجئے۔

حبیب الرحمٰن

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم

ربیع الآخر کا "الندوہ" آیا، پڑھا، اغلاطِ طبع اب اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ طبیعت مطالعہ میں الجھتی ہے تصحیح پر پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ حیف ہے کہ کتابت آیات قرآنی میں بھی فاحش غلطیاں کی گئی ہیں۔ دوسرا امر قابلِ توجہ تام، تعریف و توصیف میں پروپگنڈہ کی خصوصیات نمایاں ہو چلی ہیں جن سے اشتہار و لٹریچر سے مشابہت پیدا ہوتی جاتی ہے اس سے قلم روکا جائے۔

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۲۸ [illegible] ء

www.abulhasanalinadwi.org